سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور ۲۵

کوفہ جاتے ہوئے

حضرت امام حسینؑ نے مشیروں کا کہنا کیوں نہیں مانا؟

اگر واقعہ کربلا نہ ہوتا

تو کیا ہوتا؟

از افادات

سرکار سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی مجتہد العصر لکھنو

مدظلہ العالی

قیمت ۲ر آنے

امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور

کا تبلیغی رسالہ ۲۵ آپ کے پیشِ نظر ہے۔

سرکار سید العلماء دام ظلہ کی یہ وہ کامیاب جرنیلی تقریر ہے۔ جو ۱۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو لاہور کے عدیم النظیر، عظیم الشان جلسہ "حسینؑ ڈے" کے موقعہ پر ۵۰ ہزار کے مجمع میں ہوئی۔ یہ اجلاس لاہور کی تاریخ میں حاضری، انتظام مشترکہ مقصد، ہندوپاک کے علماء، فضلاء، ارکانِ حکومت، ہندو، مسلم سکھ، عیسائی، اچھوت، انگریز لیڈروں کی شمولیت، مقصد و اثر کے اعتبار سے اپنی مثل آپ تھا۔ زیرِ نظر تقریر کے وقت سرکارِ علامہ نے کچھ اس انداز سے "حسینؑ شناسی" کے جذبات ابھارے کہ تمام مجمع بے اختیار اچھل پڑا۔ افسوس وہ لب و لہجہ اور وہ جادو بھرا اثر الفاظ میں نہیں سما سکتا۔ مگر اس کے اثر کا لطف حاضرین کے دل و دماغ کبھی نہ بھولیں گے۔

اس تقریر کی طبع شدہ کاپی کی بڑی مانگ تھی۔ امید ہے کہ حسینیت کے پروانے اور اسلام کے شیدائی اس کو کثیر تعداد میں خرید کر مفت تقسیم کریں گے۔ ماہ محرم ۱۳۷۶ھ میں امامیہ مشن لکھنؤ نے اس بے نظیر تقریر کو پہلی بار شائع کیا:-

خادمِ دین

سید حسن علی شاہ کاظمی

سیکرٹری امامیہ مشن لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ سید الانبیاء والمرسلین
وآلہ الطیبین الطاہرین

سنہ ۱۳۶۱ھ کے بین الاقوامی اجتماعات کے بعد جو ہر شہر اور ہر قصبہ ہر دیہات
میں منعقد ہوئے تھے اور جن میں سے ہر اجتماع میں ہر قوم و مذہب کے
افراد شریک ہوئے تھے کم از کم میرے لئے اور میرے ان رفقائے کار
کے لئے جو دہلی یا لکھنؤ سے آئے ہوئے ہیں یا اس زمانہ میں دہاں کے
باشندے تھے لاہور کا یہ مظاہرۂ حسینیت کوئی حیرت خیز یا غیر معمولی
موقف نہیں۔
مگر یاد رکھئے کہ جتنا مرض شدید ہوتا ہے دوا کی تاثیر اسی قدر زیادہ
نمایاں ہوتی ہے، وہ سنہ ۱۳۶۱ھ تھا اور آج سنہ ۱۳۷۴ھ ہے۔ اتنی مدت میں حالات
میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ اس درمیان میں جو انقلابات، زلزلے، آندھیاں
اور سیلاب آئے انہوں نے زمین و آسمان کو بدل دیا ہے، ان حالات میں
یقیناً لاہور کا یہ جلسہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور یہ ایک قسم کا نیا تجربہ
ہے جو نوعِ انسانی کے سامنے پیش ہوا ہے۔
سنہ ۱۳۶۱ھ میں دلوں کے آبگینوں میں بال پڑے تھے مگر اُن کے پرخچے نہ اُڑے
تھے، اور دل میں خراشیں آئی تھیں، مگر گھاؤ نہ ہوئے تھے۔ ہمارے رجحانات کی

ہمتیں الگ الگ ہوئی تھیں، لیکن جسم جدا جدا نہ ہوئے تھے۔

مگر ۱۳۶۷ھ میں جب کہ لاہور میں آج یہ عظیم الشان اجتماع ہوا ہے وقت ہے، جب کہ حالات نے ایسا عظیم تفرقہ ڈال دیا کہ ملک کا کیا ذکر گھرانے اور گھر تقسیم ہو گئے اکثر بھائی سے بھائی، باپ سے بیٹا، شوہر سے بیوی، بہن سے بھائی کی جدائی ہو گئی۔ اس دور میں حسینیت کا یہ عجیب تجربہ ہے جو نوعِ انسانی کے سامنے پیش ہو رہا ہے اور یہ ثابت کر رہا ہے کہ گوناگوں انقلابات کے باوجود جب حسینیت کا پرچم کھل جاتا ہے تو مذاہب کا فرق اور اقوام و ممالک کا امتیاز مٹ جاتا ہے اور ہندوستان اور پاکستان ایک ہو جاتے ہیں۔

۱۳۶۱ھ سے زیادہ آج کا یہ تجربہ کارگر اور مفید ہے اس لئے کہ اسوقت ہم ایک ایسے نظام کے ماتحت گرفتار تھے کہ تمدن عالم میں ہماری آواز اثر نہ رکھتی تھی، عالم کی بین الاقوامی مجالس میں آواز بلند کرنے سے ہم گھبراتے بلکہ شرماتے تھے۔ مگر اب جب کہ ہم آزاد ہو چکے ہیں تو ہم حق رکھتے ہیں کہ بین الاقوامی عالم میں اپنے اس پیغام کو پہنچا سکیں۔

آج ہم اپنے ملک میں آزاد ہو چکے ہیں، ہر ایک اپنے اپنے وسائل کا خود مالک ہے، اقوام عالم میں کم از کم آئینی طور پر دوسروں کے ساتھ عالمی مسائل کے حل کیلئے برابر سے بیٹھ سکتے ہیں۔ بلکہ بعض جگہ ہم ثالث بن کر مسائل کو حل بھی کرتے ہیں اور دنیا ہمارے سامنے اپنے مسائل پیش کرتی ہے

تو یہ جلسہ ایک تجربہ گاہ ہے، اس کی کامیابی کے بعد میں اس مستقبل کو دیکھتا ہوں جب کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں کے اکابر و زعمائ حسینیت کے زیر سایہ عالمی مسائل کو طے کریں اور شاید آگے چل کر وہ حالات پیدا ہوں کہ "حسین ڈے" کا یہ جلسہ کل عالم کے کسی بڑے مرکز میں منعقد کیا جائے۔ خواہ امریکہ ہیں خواہ یورپ میں اور خواہ روس وغیرہ میں اور پھر اس حسینیت کے مرکز پر بین الاقوامی دکھ درد کا علاج کیا جائے۔

یاد رکھیئے کہ آج کوئی تاجدار و فاتح ممالک ایسا تصور نہیں کیا جاسکتا جس کا نام اقوام و ملل کو گلے ملا دیگا۔ چاہے وہ کتنے ہی جاہ و جلال کا مالک ہو مگر کربلا کے تڑپتے ہوئے لاشے، بہتا ہوا خون، نیزوں پر بلند ہونے والے سر آج دنیا کو ایک موقف پر لے آسکتے ہیں۔ سمجھے آپ نظام اہل بیتؑ؟

دنیا نے فتح ممالک کو کامیابی کی دلیل سمجھا، لیکن اہل بیتؑ نے فتح قلوب کو اصل فتح کی دلیل سمجھا۔ فاتحین ممالک ختم ہو گئے لیکن فاتحین قلوب اسی طرح زندہ ہیں۔

یاد رکھیئے کہ یہ فتح کا راز وہ تھا جسے حسینؑ کے مشیر کار سمجھے نہ تھے لیکن حضرت امام حسینؑ اس راز سے واقف تھے۔ مشیروں نے حضرت امام حسینؑ کو رائے دی کہ آپ کربلا نہ جائیے مگر امامؑ نے مشیروں کا کہنا نہ مانا تو کیا یہ برا کیا؟ پیغمبر اسلامؐ نے اپنے مشیروں کا کہنا کب مانا تھا؟ کسی اور کا کیا ذکر، سگے چچا کا کہنا نہ مانا۔

یہ مشیران امام مادی مستقبل سامنے رکھتے تھے اور آج کے مشیروں کا حوالہ دینے والے بھی وہی دماغ رکھتے ہیں۔ بیشک وہ محدود نگاہ کی رو سے مر گئے مٹ گئے، گود کے بچے تک شہید ہو گئے، عورتیں اسیر ہو گئیں، یہ سب مشیروں کا کہنا نہ مان کر ہوا۔ مگر پیغمبر اسلام نے بھی تو مشیروں کا کہنا نہ مان کر دکھ ہی اٹھائے۔

یہ نہ دیکھئے کہ ۱۳ برس کے بعد ہجرت ہوئی اور انصار ملے۔ لیکن ہجرت سے پہلے تیرہ برس رسول خدا نے کیا کیا دکھ نہیں سہے۔ جسم مبارک پر پتھر نہیں کھائے؟ سر مبارک پر خس و خاشاک نہیں پھینکا گیا؟ یہ سب کچھ ہوا۔ شعب ابوطالب میں ۳ برس مقیّد رہے، یہ زمانہ اتنا شدائد سے بھرا ہوا تھا کہ کبھی کبھی وقت نہ کھانا ملتا تھا نہ پانی، اکثر درختوں کے پتے کھا کھا کر گذر کی جاتی تھی۔ انہی تکالیف کا اثر تھا کہ محاصرہ سے باہر آنے کے چند ہی ماہ کے اندر حضرت خدیجہؓ اور ابوطالبؑ دونوں کی وفات ہو گئی جس کی بنا پر رسول خدا نے اس سال کا نام "عام الحزن" رکھا۔ یہ سب کچھ کہنا نہ ماننے ہی کا نتیجہ تو ہوا۔

اب دنیا بتائے کہ انہوں نے اچھا کیا یا برا۔ اور اس کا کیا نتیجہ حاصل ہوا؟ پھر اگر پیغمبر اسلامؐ کا مشیروں کے مشوروں کو رد کر دینا درست تھا تو حضرت امام حسینؑ نے بھی اگر مشیروں کا کہنا نہ مانا تو کیا برا کیا؟

کتب تواریخ میں مشیروں کا ذکر بہت جگہ ہے۔ مگر کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی یہ بات نہ ملے گی کہ کسی مشیر نے یہ رائے دی ہو کہ آپ یزید

کی بیعت کر لیجئے' مشورے اس طرح کے تھے کہ عراق نہ جائیے' طائف تشریف لے جائیے۔ یمن چلے جائیے' مکہ معظمہ میں قیام کیجئے۔ لیکن کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجئے۔

اس کے یہ معنی ہوئے کہ یزید کی بیعت کرنا امام حسینؑ کے لئے سب ہی کے نزدیک ناممکن یا ناروا بات تھی اب بیعت نہ کرنے کے بعد جن جگہوں کے متعلق مشورہ دیا جا رہا تھا ان میں سے کوئی بھی کیا ایسی تھی جو مملکت یزید کے حدود سے باہر ہو۔ لہٰذا نتیجہ یہی تھا کہ یزید کی طرف سے فوج کشی ہو۔ پنڈت دیا سن دیو مصرا کا وہ فقرہ کس قدر پسندیدہ ہے جو آپ نے اپنی آج کی تقریر کے دوران میں کہا۔ کہ "اب سوال فقط مقتل کے انتخاب کا تھا' شہادت امام حسین علیہ السلام تو یقینی تھی ہی' اگر مدینہ میں رہتے تو اسی طرح ہوتا جیسا حضرت امام حسن علیہ السلام کے ساتھ ہوا۔ اسی طرح مکہ میں ہوتے تو بھی کسی خفیہ طریقے سے خاتمہ کر دیا جاتا۔

امام حسینؑ کا مکہ چھوڑنا کن حالات میں تھا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ جو دستور فطرت کے خلاف عمل ہوا ہے ضرور غیر معمولی اسباب کا نتیجہ ماننا پڑے گا' وہ حسینؑ جو ۲۵ حج پا پیادہ کر چکے ہوں اور حج کے اس قدر مشتاق ہوں کہ مدینہ سے آ کر حج کرتے ہوں' اس طرح کہ مرکب ساتھ خالی جا رہے ہوں اور آپ پیدل جا رہے ہوں' کیا اتنے ذوقِ عبادت رکھنے والے حسینؑ کو مکہ سے آج وہ رابطہ نہ تھا جو مسلمانوں کو خانہ کعبہ سے ہوتا ہے؟ ان کا تعلق کعبہ کے ساتھ

مذہبی تعلق کے علاوہ خاندانی تعلق بھی تھا۔ وہ اُن کے باپ کا مولد بھی تھا، پھر خیال تو کیجئے کہ پیغمبرِ اسلام کا نواسہ اور ایک دن حج کا باقی رہتے ہوئے وہاں سے سفر کر رہا ہے جب کہ تمام مسلمان مکہ کی طرف حج کرنے جا رہے ہیں۔ وہ وہاں سے مکہ چھوڑ کر نکل رہے ہیں اور راہ میں قافلے والے حیرت سے پوچھتے ہیں کہ امامؑ اس وقت کدھر جا رہے ہیں، اور ہر شخص کا سوال فرزند رسولؐ کے دل پر نشتر کا کام کر رہا ہے۔ ہر ایک سے کہاں اصلی بات بتاتے کسی کسی سے کہہ بھی دیا کہ اگر میں نکل کھڑا نہ ہوتا تو قتل ہو جاتا یا گرفتار ہو جاتا (واللہ لولم اخرج لاخذت) اس لئے کہ حاجیوں کے بھیس میں سپاہی بھیجے گئے تھے کہ جب اور جہاں امامؑ ملیں انہیں شہید کر دیا جائے۔

ان ظالموں کے لئے جب وہ شہر الحرام حرام نہ تھے تو بلد الحرام اُن کے لئے حرام کہاں ہو سکتا تھا۔ جب کہ ان کو وقت کی حرمت کا خیال نہ تھا تو جگہ کی حرمت کا احترام کہاں کرتے۔

آج دنیاوی سیاست کی نظر سے اس امر کو جانچئے کہ اگر کہیں مکہ میں طواف یا سعی کی حالت میں یا نماز میں کوئی شخص آکر شہید کر دیتا تو فرزند رسولؐ شہید ہو جاتے لیکن آج تک دنیا کو یہ نہ معلوم ہو سکتا کہ قاتل کون ہے۔

صفحات تاریخ پر آج یہ معاملہ صاف ہے کہ حضرت امام حسینؑ بالکل بے جرم تھے اور انکا قاتل یزید تھا۔ لیکن اگر فرزند رسولؐ اس صورت میں شہید

ہو جاتے تو قاتل امام پوشیدہ ہو کر زندہ رہتا۔ امام حقیقی معنوں میں قتل ہو جاتے اور آپ کا مقصد بھی آپ کے ساتھ ہی قتل ہو جاتا۔

کیا مشیران امام اتنے دور رس تھے جو ان نتائج کو مدِ نظر رکھ کر مشورہ دیتے؟ ان میں کچھ واقعی ہمدرد تھے اور کچھ نمائشی طور پر خیر خواہ تھے جو سیاست کے ماتحت ہمدرد بن رہے تھے۔ مگر سب کے مشورے صرف وقتی حالات کی بنا پہ جذبات سے متاثر ہو کر دیئے گئے تھے۔ مگر امام حسین علیہ السلام جذبات سے بلند تر تھے کیونکہ جذبات سے بلند ہستی کا نام ہی معصوم ہے اور انہوں نے مشوروں کی مخالفت کر کے اپنا جذبات سے بلند ہونا دکھا دیا اور ثابت کر دیا کہ وہ جذبات سے کسی طرح متاثر نہیں ہوتے۔

کہا جاتا ہے کہ کربلا کا واقعہ اس قدر اہمیت کیوں رکھتا ہے؟ یا اس کو اس قدر اہمیت کیوں دی جاتی ہے؟ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ مگر اب جب کہ واقعۂ کربلا ہو چکا میں کیا بتاؤں کہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا جس نے تاریکی نہ دیکھی ہو اور دن ہی کو آنکھ کھولی ہو وہ پوچھے کہ سورج نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ تو اسے کس طرح بتایا جا سکتا ہے۔

امام نے جو قربانی پیش کی ہم نے اسکی برکات کے زیرِ سایہ آنکھ کھولی ہے۔ آپ نے حقانیت کا ایسا سورج چمکایا جو غروب ہونے والا نہیں لہٰذا اب کوئی کیا سمجھے کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا، یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی کہے کہ

خدا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ ظاہر ہے کہ خدا نہ ہونے کا تجربہ ہی کسی کو نہیں ہو سکتا، کیونکہ خدا ازل سے ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو یہ جو کچھ آج ہے کچھ بھی نہ ہوتا ہماری دینی زندگی جسکو دوسرے لفظوں میں انسانی زندگی کہوں گا اور شریفانہ باشعور باعزت اور خود دار زندگی اس سب کا کچھ پتہ نہ ہوتا۔ اذانیں نہ ہوتیں، اقامت نہ ہوتی، نماز نہ ہوتی، روزہ نہ ہوتا، حج نہ ہوتا، قرآن نہ ہوتا، اخلاق نہ ہوتا، احساس نہ ہوتا تمدن نہ ہوتا، تہذیب نہ ہوتی، مساوات و اخوت نہ ہوتی، حریت نہ ہوتی جذبۂ شہادت نہ ہوتا، حقانیت نہ ہوتی اور حق پرستی نہ ہوتی، اب اس کے بعد میں کیا بتاؤں کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ مگر ابھی تک تو یہ دعویٰ ہی دعویٰ معلوم ہوتا اس کے ثبوت کیلئے میں کہوں گا۔ یہ دیکھئے کہ واقعۂ کربلا نہ ہوا تھا تو کیا ہو رہا تھا اور خدا کی قسم جو ہو رہا تھا وہ ایسا ہے کہ اب یقین مشکل سے آتا ہے کہ یہ ہو رہا تھا۔

جس پیغمبرؐ نے یہ نمونہ پیش کیا ہو کہ دین و دنیا کا اقتدار زیرِ قدم رکھتے ہوئے کئی کئی وقت پیٹ پر پتھر باندھا اور کھانا نہ کھایا ہو اور جس پیغمبرؐ نے ہمیں یہ نمونہ دکھایا ہو کہ وہ معزز بیٹی جس کی تعظیم کو آپ کھڑے ہو جاتے ہوں یعنی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اپنی جگہ تو ان کا یہ اعزاز مگر جب انہیں کنیز سپرد فرماتے ہیں تو کنیز کے ساتھ مساوات کا اتنا خیال فرماتے ہیں، کہ بیٹی گھر کا سارا کام کاج فضہ پہ نہ ڈالنا بلکہ ایک دن گھر کا کام خود کرنا اور ایک دن فضہ سے لینا۔ چنانچہ بیٹی نے ایسا ہی کر کے دکھا دیا کہ ایک دن فضہ لونڈی کھانا پکاتی اور کام کاج کرتی اور حضرت فاطمہؑ آرام فرمائیں

اور دوسرے روز حضرت فاطمہؑ گھر کا کام کرتیں اور فضہ آرام کرتیں، لوگ کہتے ہیں کہ غلامی کو ختم کیوں نہ کر دیا؟ اگر ایسا ہوتا تو معیارِ غلامی اپنی جگہ ہی رہتا۔ آلِ رسولؐ نے بتایا کہ یہ تو باہمی تعاون کے ذریعے ہیں، آقا غلام، خاوند بیوی وغیرہ۔ یہ رشتے گھر کے افراد میں شمول کا ذریعہ ہیں۔ ان کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں، مگر ذہنیت بدلنے کی ضرورت ہے۔ آج جب چھوٹے بھائی سے یہ سلوک روا رکھا جاتا ہے اور کہتے ہیں "سگ باش برادرِ خورد مباش" تو ہمارے اس تمدن میں غلام، کنیز کے ساتھ اچھا برتاؤ کہاں ہوگا۔ مگر یہ قصور ہمارے تمدن کا ہے۔ آلِ محمدؐ کے غلاموں اور کنیزوں سے پوچھو کہ تم کو آزاد ہونا منظور ہے یا غلام رہنا آج کی آزادی ہزار غلامی سے بدتر اور وہ غلامی رشکِ تاجداری تھی، وہ فاطمہ زہراؑ کا حسب ہدایت پیغمبرؐ برتاؤ اپنی کنیز فضہ کے ساتھ اور اسی طرح حضرت علیؑ کا برتاؤ اپنے غلام قنبر کے ساتھ اس وقت نہیں جب کہ آپ خانہ نشین تھے بلکہ اس وقت جب کہ آپ شہنشاہ تسلیم کئے جا رہے تھے۔ ایسے وقت قنبر کے ساتھ جو برتاؤ آپ نے دکھلایا کہ بازار سے دو پیراہن خریدے ایک سات درہم کا دوسرا پانچ درہم کا۔ پہلا پیراہن اپنے غلام قنبر کو حضرتؑ نے عطا فرمایا اور پانچ درہم والا خود زیبِ تن کیا۔ قنبر عرض کرتے ہیں کہ حضور یہ کچھ بہتر ہے آپ اسے زیبِ جسم فرمائیے۔ ہم میں سے آج کا کوئی آدمی اول تو ایسا کرتا ہی کیوں۔ اگر کوئی لیڈر قسم کا آدمی ایسا کر بھی دیتا تو جب قنبر نے عرض کیا تھا کہ حضور یہ بہتر ہے آپ پہن لیں تو وہ فوراً اپنی مصلحانہ حیثیت کا علم اونچا کر دیتا، وہ جواب میں ایک تقریر کر دیتا کہ

کہ قنبر میں دنیا سے اس تفرقہ کو ختم کرنا چاہتا ہوں میں دنیا میں غلاموں کا معیار بلند کرنا چاہتا ہوں وغیرہ وغیرہ لیکن حضرت علیؑ نے یہ جواب نہیں دیا۔ حالانکہ پیش نظر یہی تھا لیکن قنبر سے اگر یہ فرماتے تو اس جواب میں خود عدم مساوات مضمر تھی اس ارشاد سے قنبر کو احساس غلامی پیدا ہو جاتا۔ آپ قنبر کو ایسا جواب دیتے ہیں، جیسا اپنے بچوں کو دیا جاتا ہے کہ تم جوان ہو تمہیں یہ پیراہن اچھا لگتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ خود جس طرح کی تربیت مسلمانوں کی کرنا چاہتے تھے وہ اس واقعہ سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت کے پاس صف میں ایک رئیس خالی جگہ پا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ اتنے میں ایک غریب بوسیدہ کپڑوں والا جو آدابِ نبویؐ کا عادی ہے آ کر اس رئیس کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہے رئیس صاحب نے اپنے معیارِ طبیعت کے لحاظ سے بہت اخلاق سے کام لیا، بہت ضبط سے کام لیا اپنا دربار ہوتا تو شاید یہ اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر نکال دیتے اور بدتمیز کہہ دیتے۔ مگر وہ بارگاہِ پیغمبر تھی۔ یہاں یہ ممکن نہ تھا پھر بھی فطری طور پر ذہنیت کا مظاہرہ اس طرح ہو گیا کہ رئیس نے اپنا لباس سمیٹ لیا۔ پیغمبر اسلامؐ نے اتنا بھی گوارا نہ کیا اور خلقِ عظیم کی تیوریوں پر بل آ گئے اور فرمایا یہ تم نے کیا کیا؟ کیا اس کی غربت تم میں آجاتی یا تمہاری ریاست اس کو مل جاتی یا چلی جاتی، دامن کیوں سمیٹا؟"

مربیٔ اعظم کی اس تنبیہ کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ وقتی طور پر اسکا ضمیر شرمندہ ہوا اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ اس گناہ کے کفارہ میں میں اپنی نصف دولت اس غریب بھائی کو دیتا ہوں۔ متبسم ہوتے ہوئے حضورؐ غریب کی طرف متوجہ ہوئے کہ یہ نصف دولت کی

پیشکش تم کو منظور ہے ! غریب صحابی نے جواب میں عرض کیا کہ میں اسے شکریہ کے ساتھ واپس کرتا ہوں، حضورؐ نے فرمایا کہ یہ خوشی سے دے رہا ہے، اس نے عرض کیا کہ مجھے ڈر ہے کہ یہ ذہنیت کہیں مجھ میں نہ پیدا ہو جائے۔

محض اخلاق کی کتابوں میں نمائشی طور پر اصول کو درج کر دینا آسان بات ہے۔ لیکن جیتی جاگتی عمل کی دنیا میں اتنی کم مدت میں اس کو پیش کر دینا یہ بڑی مشکل بات ہے۔ پیغمبرِ خداؐ نے ہر تعلیم کو عمل کی صورت میں دنیا کے سامنے زندہ مجسمے کی شکل میں پیش کر دیا کہ میرا نظام نفط ذہنی یا دماغی نہیں بلکہ عملی ہے، وہ زندہ نظام ہے جو سیرت و کردار کی شکل میں آنکھوں کے سامنے نمودار ہوتا ہے۔ میرا آئین اخلاق لفظی نہیں بلکہ بالکل عملی ہے یہی وجہ ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ اہل بیتؑ کی ضرورت ہوئی اور ارشاد ہوا انی تارِکٌ فِیکُمُ الثَّقَلَین کِتابَ اللّٰہِ وَعِترتی۔

اور اسی لئے ان اہل بیتؑ کو مباہلہ کے میدان میں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ میرا عقیدہ ہے اور میرے نزدیک ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا چاہئیے کہ دعائے رسولؐ کسی کی آمین کی محتاج نہ تھی بلکہ ان میں سے ہر فرد کی دعا تنہا کافی تھی، مگر خالقِ اکبر نے نبی علیہ السّلام کو ہدایت فرمائی کہ ان سب کو ساتھ لے جاؤ منزلِ مباہلہ میں۔ اسلئے کہ جب صادقین اور کاذبین میں مقابلہ ہو رہا ہے تو دنیا جان لے کہ خالص صادقین افراد یہ ہیں اور جب رسالتمآبؐ دنیا سے اُٹھ جائیں تو جو کام آپ کے بعد ان سے لیا جاتا ہے وہ زندگی ہی میں ان سے لے لیا جائے، اس لئے نصرتِ اسلام کیلئے آج انکو ساتھ

لیا اور شریکِ کار بنایا، مباہلہ کے اس شریکِ کار ہونے میں سب سے کم سن حسینؑ تھے اور ان کو رسولؐ خود اپنی گود میں لے گئے تھے۔ پیغمبرِ خداؐ کی نگاہ ماضی کے آئینے میں مستقبل کا نقشہ دیکھ رہی تھی کہ اسی حسینؑ کی قربانی کی دنیا کو ضرورت پیش آئے گی۔ چنانچہ سنہ ۶۱ھ میں وہ پیش آگئی۔ یہ اہلبیتؑ دنیا میں اسی لئے چھوڑے گئے تھے اور ان کا تعارف مسلمانوں سے اسی لئے کرایا گیا تھا کہ یہ اسلامی نظام و تمدن کی زندہ تصویر تھے۔ کیا حیرت کی بات نہیں ہے کہ جن مسلمانوں کی تربیت اس معیار پر کی جا رہی ہو، ان مسلمانوں میں صرف پچاس برس کے بعد ہی یہ وقت آگیا کہ دارالحکومت اسلامی میں ریشم کے پردے لٹک رہے ہوں اور غلام زریں کمر بند لگائے ہوئے بادشاہ کے سامنے کھڑے ہوں اور دروازوں کے اوپر پہرے لگے ہوں تاکہ کسی غریب کی رسائی نہ ہو سکے اور کسی مظلوم کی فریاد اس کے کانوں تک پہنچنا ناممکن ہو جائے یہی نہیں بلکہ بادشاہ کے سامنے طلا و نقرہ کے برتنوں میں پانی پلایا جا رہا ہو۔

یہ سب باتیں یزید سے پہلے ہو چکی تھیں اور اگر کوئی صحابی مثلاً عبادہ بن ثامت وغیرہ ٹوکتے بھی تھے تو ان کو ندامت پسند ہونے کی سند ملتی تھی۔ یاد رکھئے یہی حالات ترقی کر کے یزید کے کردار کے درجہ تک پہنچے۔ یزید سے پہلے سونے چاندی کے برتنوں میں پانی پیا گیا جو ظرف کے اعتبار سے شرع اسلامی میں حرام ہے تو یزید کے یہاں شیشے کے جاموں میں شراب پی جانے لگی اور شراب کے دور چلنے لگے۔ اب بجائے صدائے تکبیر کے نائے و نوش کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں رنگ برنگ کی محفلوں میں نماز کا

وقت آکر گزر جاتا لیکن رونق محفل میں کچھ فرق نہ آتا۔

غضب یہ ہے کہ یہ سب جانشینی رسولؐ کے نام پر ہو رہا ہو اور سب مسلمان درباری وغیرہ مان رہے ہوں، اور یہ ہونا اتنا حیرت ناک نہیں جتنا کہ عام طور پر مسلمانوں کا ماننا۔ یعنی یہ سب کچھ ہو رہا ہو اور مسلمان اس حاکم کو خلیفۂ رسولؐ مان رہے ہوں۔ آج کا مسلمان ضرور حیرت سے یہ پوچھے گا کہ کیا مسلمان اس کو مان رہے تھے۔

جی ہاں سب مان رہے تھے۔ اگر سب نہ مان رہے ہوتے تو تاریخ شمار کر کے کیوں بتاتی کہ فلاں فلاں نے نہیں مانا۔ تاریخ کا شمار کرنا بتا رہا ہے کہ اور سب مان رہے تھے۔ وفات پیغمبرؐ کے پچاس برس کے بعد ہی احساس مذہبی کا یہ حال ہو چکا تھا۔ اور ۶۱ھ سے اب تک کہ تیرہ سو برس ہو چکے ہیں مگر جب کہ عموماً احساس کیا جاتا ہے کہ اسلام گھٹتا چلا جا رہا ہے اور تمدن و تہذیب کی حدیں پامال ہو رہی ہیں۔ مگر ۶۱ھ کے مقابل میں اس وقت بھی حالت بہتر ہے اور یہ مجمع کم نہیں ہے۔ مگر میں اسی جلسہ کے مجمع سے شہر اور دیہات سے آئے ہوئے تمام لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا ان میں سے کوئی ایک بھی یزید ایسے شخص کو جانشینِ رسولؐ مان سکتا ہے۔

آج کے جاہل سے جاہل اور فاسق سے فاسق مسلمان سے بھی پوچھا جائے تو یزید ایسے کسی آدمی کو جانشینِ رسولؐ نہ مانے گا۔ لیکن رسولِ خداؐ

کی وفات کے صرف پچاس برس کے بعد لوگ مان رہے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی کسی ثبوت کی ضرورت ہے کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

ظلم اور فسق و فجور سے یہ نفرت کیونکر پیدا ہوئی۔ یہ واقعۂ کربلا کا فیض ہے۔ آج کا یہ جلسہ اور اس طرح کی تمام یادگاریں اس اثر کو زندہ رکھنے کے لئے ہیں۔ اسی کے لئے عزاداری ہوتی ہے اور اسی کے لئے نامِ حسینؑ کی تکرار کی جاتی ہے۔

اب بھی سوال ہوگا کہ حسینؑ نے مشیروں کا کہنا کیوں نہ مانا۔ اور یہ کہ آپ یزید کی بیعت کر لیتے تو کیا ہرج تھا۔ میں کہوں گا کہ وہ حسینؑ نہ ہوتے جو مان لیتے کوئی اور ہوتا۔ حسینؑ تو کبھی پشیمان نہیں ہوئے کہ مشیروں کا کہنا کیوں نہ مانا۔ حسینؑ کے ساتھ والا بھی کوئی پشیمان نہ تھا، کوئی بچہ حسینؑ کے ساتھ کا نادم نہ ہوا، اور ادھر کوئی اور کیا خود یزید ملعون نادم ہوا۔ مگر یاد رکھئے اس فرق کو کہ وہ ندامت زندگی ضمیر کا نتیجہ نہ تھی جسے توبہ سمجھا جا سکے بلکہ وہ احساسِ شکست کا نتیجہ تھی۔ اب اس خیال سے کہ میرے بعد والے مقررین پر ظلم ہوگا اور مجھے خود جلسہ کے مفاد کا بھی احساس ہے۔ اسلئے اپنی تقریر کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ خدا کرے جس طرح آج کے جلسہ میں اجسام یک جا ہوئے ہیں اسی طرح ہمارے دل و دماغ بھی یکجا ہو جائیں اور حسینیت کا جھنڈا خدا کرے برابر لہراتا رہے! اور مشرق سے مغرب تک کو اپنے سائے میں لے لے۔ (آمین)

(علی نقی النقوی)

(مطبوعہ:۔ تعلیمی پریس لاہور)